اسلامی حکومت میں

عدلیہ کا مقام اور اختیارات

سید معروف شاہ شیرازی

انسان ایک مدنی الطبع مخلوق ہے۔ اس کی تخلیق میں اجتماعیت پوشیدہ ہے۔ یہ ہمیشہ اجتماعی شکل میں رہا ہے' خواہ یہ اجتماع خاندان کی شکل میں ہو یا ایک گاؤں کی شکل میں' بڑے بڑے شہروں کی شکل میں ہو یا پھر جدید طرز کے ممالک کی شکل میں یا اس سے بھی آگے ملل کی شکل میں۔ بہرحال انسان اپنے آپ کو کسی نہ کسی اجتماعیت کے ساتھ ضرور وابستہ کرتا ہے۔

ان تمام اجتماعیتوں میں' دین اور ملت کا اجتماع یا نظریات اور فکری اتحاد کا اجتماع' "ممالک" کی حدود سے بالا ہوتا ہے' مثلاً ملت اسلامیہ جغرافیہ کی حدود و قیود کی پابند نہیں ہے۔ مسلم جہاں بھی ہو' انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے' مسلم ہے اور اس کی اپنی ایک سوسائٹی ہے۔

اجتماعی زندگی میں انسانوں کے درمیان تنازعات پیدا ہوتے ہیں' ان کو طے کرنے اور فیصلہ کرنے کے لیے مملکت کا اجتماعی نظام وجود میں آتا ہے۔ اس اجتماعی نظام کا مقصد وحید یہ ہوتا ہے کہ تمام انسانوں کے درمیان انصاف قائم کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم و جدید تمام ریاستی نظاموں میں عدلیہ کو نہایت ہی اعلیٰ مقام دیا گیا ہے۔ جدید ریاستوں کے دساتیر و روایات میں عدلیہ' ریاست کا نہایت ہی اہم' برتر اور خود مختار حصہ ہوتی ہے۔ اس لیے کہ جس طرح ایک انسان اور انسان کے درمیان اختلافات اور تنازعات پیدا ہو سکتے ہیں' خود ریاست اور اہل کاران ریاست کے ساتھ بھی بعض افراد کے اختلافات اور تنازعات پیدا ہو سکتے ہیں۔

قرآن اور سنت کا تصور عدل

اسلام کے تصور عدل کے مطابق' قرآن کریم اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی ریاست کا اساسی قانون (fundamental law) اور دستور ہیں۔ ان میں اسلامی معاشرے کے لیے ناقابل تغیر اسلامی

قوانین وضع کیے گئے ہیں۔ قرآن کریم اسلامی ریاست پر لازم قرار دیتا ہے کہ اس کے تمام فیصلے بذریعہ عدالتی حکم (decree) نافذ ہوں اور جو ایسا نہیں کرتا وہ ظالم (المائدہ ۵:۴۵)، فاسق (المائدہ ۵:۴۷) بلکہ کافر (المائدہ ۵:۴۴) ہے۔ یہ آیات تو ایک مسلمان یا ایک انسان اور انسان کے درمیان فیصلوں کے بارے میں ہیں۔ لیکن اگر ایک عام انسان اور حکومت کے درمیان تنازع اٹھ کھڑا ہو، رعیت اور راعی کے درمیان کوئی تنازع ہو تو اس کا فیصلہ بھی اللہ اور رسولؐ کی عدالت میں لے جانا ضروری ہے۔ اسلام میں عدالتی چارہ جوئی کی جواب دہی سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے۔ قرآن مجید اس بات کی صراحت کرتا ہے کہ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِىْ شَىْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (النساء ۴:۵۹) "اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو اللہ کے رسولؐ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر تمھارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسولؐ کی طرف پھیر دو"۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا فورم ہے جو اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس تنازعے کا فیصلہ کرے گا۔ زمانہ نبوتؐ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بطور نبی، قرآن کے حامل اور سنت رسولؐ کا مجسمہ تھے۔ آپؐ اللہ کے رسول اور نمایندے تھے۔ یوں ان کی طرف لوٹنے والا تنازع، اللہ اور رسولؐ اللہ کی طرف لوٹ آتا تھا اور آپؐ کو واضح حکم تھا کہ آپؐ اللہ کے قانون کے مطابق فیصلے کریں۔ اب یہ فورم بالاتفاق اور بالاجماع، اسلامی عدلیہ ہے۔ یوں اسلامی تصور عدل کے مطابق، اسلامی ریاست کے دوسرے بنیادی اداروں، انتظامیہ اور مقننہ کے مقابلے میں، اسلامی عدلیہ اور سپریم کورٹ کو ایک گونا برتری اور تقدس حاصل ہوتا ہے کہ وہ خدا اور رسولؐ خدا کے جانشین ہوتے ہیں اور برتر مقام رکھتے ہیں (معین الحکام، طرابلسی، ص ۲)۔ علامہ قرافی نے اس نکتے کی وضاحت نہایت صراحت سے کی ہے کہ ججوں کے لیے یہ لازمی ہے کہ وہ قرآن و سنت کے مطابق فیصلے کریں اور اجتہادی امور میں اشباہ و نظائر کے مطابق اپنی رائے سے فیصلے دیں اور جب کوئی جج اپنی اجتہادی رائے سے کوئی فیصلہ کرے تو اس کا فیصلہ اس متعین مقدمے میں نص من اللہ ہو جاتا ہے۔ اس کی رائے گویا آیت من آیات اللہ ہو جاتی ہے اور وہ جج ڈگری پاس کر کے گویا متکلم من اللہ ہوتا ہے۔ کیونکہ نصوص شریعت نے جج کو یہ مقام دیا، کہ گفتہ او گفتہ اللہ بود (الفروق، شہاب الدین قرافی، ج ۲، ص ۲۵، دار الکتب، بیروت)۔

مثلاً، ایک جج یہ فیصلہ کرے کہ عبدالرحمٰن نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین مرتبہ طلاق دے دی ہے، یہ ایک واقع ہوئی ہے اور وہ اپنی بیوی سے دوبارہ نکاح یا عدت میں رجوع کر سکتا ہے تو کوئی مفتی، عبدالرحمٰن کے واقعے میں، اس کے خلاف فتویٰ نہیں دے سکتا۔ اس کا نکاح احناف کے نزدیک بھی جائز ہو گا، اولاد کا نسب ثابت ہو گا وغیرہ۔ اسی طرح ایک شخص اگر اپنی ساس کے ساتھ مجامعت کرے اور جج یہ فیصلہ کر دے

کہ بیوی اس پر حرام نہ ہو گی تو اس خاص مقدمے میں نکاح جائز ہو جائے گا کیونکہ یہ اجتہادی مسئلہ ہے (لسان الحکام، ابن شحنہ حنفی، ص ۷، حاشیہ معین الحکام)۔ میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ کسی قاضی کے فیصلے کے نتیجے میں لوگوں کا مسلک اور نظریہ اور رائے بدل جائے گی، یا اہل مسلک اپنے مسلک اور تحقیقات سے دست بردار ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ عبدالرحمٰن اور اس کی بیوی کی حد تک فریقین کے حق متعین ہو جائیں گے اور عبدالرحمٰن کی بیوی کا اگر عقیدہ حنفی بھی ہو اور وہ تین طلاقوں کو تین ہی سمجھتی ہو لیکن وہ اس کی بیوی رہے گی۔ البتہ عبدالرحمٰن اور اس کی بیوی کے علاوہ دوسرے حنفیوں پر اس جج کے فیصلے کا اطلاق نہ ہو گا۔ دوسرے لوگوں کے استفتا پر، حنفی فقہا بدستور اپنے مسلک کے مطابق فتویٰ دے سکیں گے اور دوسرے لوگ اپنے مسالک کے بارے میں آزاد ہوں گے۔

اسلام میں عدلیہ کا دائرہ اختیار (Jurisdiction)

یہاں ایک اہم سوال ہمارے سامنے یہ آتا ہے کہ اسلامی تصور عدل کے مطابق، اسلامی عدلیہ کا سرچشمہ اختیارات کیا ہے؟ اسلامی شریعت کی رو سے، قاضی القضاۃ کے اختیارات، خصوصاً وہ اختیارات جن کا تعلق ریاستی امور کی عدالتی نظرثانی (review power) سے ہوتا ہے، ان کا سرچشمہ "قرآن و سنت" ہیں۔ ججوں کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ قرآن و سنت کے مطابق بلاروک ٹوک فیصلے کریں۔ ان کے اختیارات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

ہمارے فقہا نے یہ تصریح کی ہے کہ قاضی القضاۃ چند خالص انتظامی معاملات کے سوا تمام دوسرے امور کے بارے میں احکام صادر کر سکتا ہے۔ علامہ ابن فرحون لکھتے ہیں:

> قرافی کا خیال ہے کہ قاضی کے اختیارات میں صرف عدالتی احکام آتے ہیں۔ قاضی کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ فیصلے نافذ کرے یا سزائیں دے۔ خصوصاً ایسے قاضیوں کے دائرہ کار میں یہ امور نہیں آتے جن کے پاس قوت تنفیذ نہ ہو، مثلاً بڑے بادشاہوں (ڈکٹیٹروں) کے خلاف تو کوئی قاضی کسی فیصلے کے نفاذ (execution) کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس لیے ایک جج کا کام صرف یہ ہے کہ وہ فیصلے کا اعلان کر دے۔ رہا فیصلے کا نفاذ تو وہ اس کے فیصلے کے بعد ایک زائد امر ہے۔ اس لیے کہ حکام کبھی تو قاضیوں کو نفاذ حکم کے اختیارات دیتے ہیں اور کبھی نہیں دیتے (کبھی وہ تعاون کرتے ہیں کبھی نہیں کرتے)۔ ہاں غنائم اور بیت المال کی رقومات کی تقسیم کے اختیارات ججوں کو نہیں ہوتے۔ اس طرح حدود و تعزیرات کا نفاذ، فوجی تیاریوں، باغیوں کی سرکوبی، زمینوں کی تقسیم و انتظامات میں بھی قاضیوں کو اختیار نہیں ہے۔ یہ اختیارات کوئی جج صرف حکومت وقت کی اجازت سے استعمال کر سکتا ہے" (تبصرہ الحکام، ابن فرحون، ج ۱، ص ۱۲۔ معین الحکام، طرابلسی،

ص ۱۱)۔

قاضی قرافی نے یہ جو کہا ہے کہ ججوں کے پاس سزاؤں کے نفاذ کا اختیار نہیں ہے' یہ محل نظر ہے۔ مذاہب اربعہ کی روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسے یہ اختیار حاصل ہے۔

ججوں کے اختیارات کے سرچشمے

فقہائے اسلام نے ججوں کے اختیارات اور دائرہ کار کے تین سرچشموں کی نشان دہی کی ہے:

۱۔ حکومت وقت یا قاضی القضاۃ کو مقرر کرنے والی اتھارٹی' یعنی وہ اختیارات جو کسی بادشاہ' کسی ڈکٹیٹر' کسی خلیفہ نے اسے تحریری طور پر یا زبانی طور پر دیے ہوں۔ گویا تقرری کی دستاویز' اس کے اختیارات کا اصل سرچشمہ ہے۔ جس طرح نبی کریمؐ نے حضرت معاذ ابن جبلؓ کو اور حضرت عمرؓ نے اپنے قضاۃ کو تحریری اور زبانی ہدایات دیں۔

۲۔ دوسرا سرچشمہ "عرف" ہے۔ فقہا نے عرف عام اور وقت کے دستور کو بھی قاضیوں کے اختیارات کا سرچشمہ تسلیم کیا ہے۔ (تبصرة الحکام' ابن فرحون' ج ۱' ص ۱۳' معین الحکام' طرابلسی' ص ۱۲)۔

"عرف" سے کیا مراد ہے؟ وہ دستوری روایات یا رسم و رواج' جن کے مطابق کسی سوسائٹی کا دستوری نظام طے ہوتا ہے' دور جدید کا عرف تصور ہو گا۔ برطانیہ میں آج بھی غیر تحریری دستور ہے۔ گویا بنیادی قوانین کا تعین' برطانیہ کا عرف اور دستوری روایات ہی کریں گی۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے' قرآن و سنت اسلام کے بنیادی اور دستوری قوانین ہیں۔ البتہ کسی ملک کے لیے قرآن و سنت کے علاوہ بھی کسی دستوری نظام کا تعین ہو سکتا ہے' اس شرط پر کہ یہ نظام قرآن و سنت کے خلاف نہ ہو۔ جس طرح پاکستان کا دستور ہے۔

حضور اکرمؐ جب مدینہ تشریف لائے تو قرآن و سنت کے موجود ہوتے ہوئے بھی' آپؐ نے ایک میثاق تیار فرمایا جس کو بجا طور پر ایک تحریری دستور قرار دیا جاتا ہے۔ اس پر مسلمانوں' مشرکین مدینہ' یہودی قبائل اور بعض دوسرے قبائل نے بھی دستخط کیے۔ ابن ہشام کے مطابق اس کی ۵۱ دفعات تھیں۔ اس میں بھی عدالتی اختیارات اللہ اور رسولؐ اللہ کے سپرد کیے گئے تھے۔ دفعہ ۲۵ یہ ہے:

If there is any dispute over any matter, it shall be referred to Allah and to Muhammad۔ اس دفعہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ رسولؐ اللہ کا لفظ نہیں لکھا گیا کیونکہ اس پر دستخط کرنے والے بعض قبائل حضورؐ کو نبی نہ مانتے تھے لیکن اس میں یہ تسلیم کرایا گیا کہ فیصلہ قانون الٰہی کے مطابق ہو گا۔ The Shape of Basic Organs in Islamic State, by

Maroof Shah, p 53) - ضمیمہ بھی ملاحظہ کیجیے)۔

۳- حاکم وقت کی تقرری اور عرف و دستور کے مطابق تقرر کے علاوہ، ایک تیسرے طریقے کا بھی فقہا نے ذکر کیا ہے۔ اگر کسی جگہ حکومت نہ ہو اور کوئی دستوری روایت بھی نہ ہو، یا مقامی لوگ حکومت کی جانب سے کسی قاضی کا تعین نہ چاہتے ہوں یا ان کے لیے حکومت کی منظوری لینا ممکن نہ ہو یا حکومت موجود نہ ہو، مثلاً عبوری دور ہو یا انقلابی دور ہو اور ابھی باقاعدہ حکومت نہ ہو وغیرہ، تو اس صورت میں اہل حل و عقد باہم اتفاق کر کے کسی اہل شخص کو علاقے کا قاضی مقرر کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ یہ لوگ جو مقرر کرنے والے ہیں، وہ اہل حل و عقد ہوں اور جس شخص کو مقرر کر رہے ہوں، اس کے اندر وہ تمام صفات پائی جاتی ہوں، جو قاضی کے لیے ضروری ہیں۔ برعظیم میں، انگریزی دور میں، کئی علاقوں میں لوگوں نے انگریز ججوں کے مقابلے میں اس طرح اپنے قاضی مقرر کر رکھے تھے اور وہ شرعی فیصلے کرتے تھے۔

اس صورت میں اس قسم کے جج کی عدالت گویا عوامی عدالت قرار پاتی ہے۔ ایسی عدالت کے اختیارات (jurisdiction) اور حدود کار، وہ ہوتے ہیں جو عوام یا کسی سوسائٹی کے ارباب حل و عقد طے کر دیتے ہیں۔ ایسے جج کے فیصلوں میں قوت نافذہ بھی عوام کا اٹل ارادہ ہی قرار پاتا ہے۔

اس قسم کا جج یا قاضی چونکہ عوامی ارادے کے مطابق کام کرتا ہے، اس لیے اس قسم کی عدالت نہایت ہی مضبوط عدالت ہوتی ہے اور وہ نہایت ہی مضبوط فیصلے کرتی ہے۔ کیونکہ اس کی پشت پر ایک عوامی قوت ہوتی ہے۔ (تبصرۃ الحکام، ابن فرحون، ج ۱، ص ۱۵، بحوالہ علامہ مازری)۔

ماتحت ججوں کا تقرر

اسلامی عدلیہ کی تاریخ گواہ ہے کہ صرف چیف جسٹس کے تعین اور تقرر میں، انتظامیہ، خلیفہ، صدر مملکت یا وزیراعظم کا دخل ہوتا ہے۔ یہ کام کوئی بھی حکمران کر سکتا ہے، خواہ وہ کوئی ڈکٹیٹر ہو یا کوئی منتخب خلیفہ، وزیراعظم ہو یا صدر مملکت۔ یہ کام حالات زمانہ، وقت کے دستور اور رواج پر موقوف ہے۔ یہ تقرری سربراہ مملکت بطور نائب عامتہ المسلمین کرے گا، اس لیے کہ اگر مذکورہ لوگ معزول ہو جائیں تو چیف جسٹس معزول نہ ہو گا" (بدائع الصنائع، الکاسانی، ج ۷، ص ۱۶)۔

اسلامی تصور عدل کے مطابق ماتحت ججوں کا تقرر بہرحال قاضی القضاۃ کا کام ہے۔ اسلامی عدلیہ کی تاریخ و روایات میں اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ چیف جسٹس کے لیے مناسب ہے کہ وہ ماتحت ججوں کے تقرر کے وقت حاکم وقت یا گورنر کے ساتھ مشورہ کرے۔ ان ماتحت ججوں کے اختیارات وہی ہوں گے جو قاضی القضاۃ ان کے سپرد کرے۔ قاضی القضاۃ کو یہ اختیار ہو گا کہ وہ ان کو معزول کر دے اور ماتحت جج کا مرتبہ قاضی القضاۃ کے برابر ہو گا۔ فرق صرف یہ ہو گا کہ قاضی القضاۃ کے حدود اختیارات وسیع ہوں گے جبکہ اس کے

محدود ہوں گے۔ (بدائع الصنائع، الکاسانی، ج ۷، ص ۱۶)۔

دور حاضر میں اکثر ممالک میں تحریری دستور بنا دیے گئے ہیں اور اکثر دساتیر میں یہ طے ہوتا ہے کہ قاضی القضاۃ، سپریم کورٹ یا کسی بھی اعلیٰ ترین عدالت کے ججوں میں سے مقرر کیا جائے گا۔ اب اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے کہ اعلیٰ عدالتوں کے جج قاضی القضاۃ کے مقرر کردہ ہوں گے، تو اس طرح جو بھی قاضی القضاۃ مقرر ہو گا، وہ درحقیقت خود عدلیہ کا مقرر کردہ ہو گا۔ کسی سربراہ ریاست کی جانب سے اس کی تقرری، ایک رسمی تقرری ہو گی۔

سپریم کورٹ پاکستان نے اپنے حالیہ فیصلے کے ذریعے ہمارے موجودہ دستور میں پائی جانے والی دفعات کی تشریح کر دی ہے۔ چیف جسٹس اور ماتحت ججوں کی تقرری کے بارے میں ہمارے دستور کی دفعات یہ ہیں:

آرٹیکل ۱۷۷(۱) چیف جسٹس کا تقرر صدر کریں گے اور دوسرے ججوں کا تقرر صدر، چیف جسٹس کے ساتھ مشورے کے بعد کریں گے۔

یہ ایک اہم سوال ہے کہ چیف جسٹس کے ساتھ مشورے کا کیا مطلب ہے۔ کیونکہ اگر کوئی کسی کے ساتھ مشورہ کرے اور اس کے بعد اپنی مرضی کرے، تو وہ کوئی بامقصد مشورہ نہ ہو گا۔ تمام دنیا میں ڈکٹیٹر اور برخود غلط سربراہ، ججوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے رہے ہیں۔ لیکن اسلامی تاریخ اور اسلامی روایات گواہ ہیں کہ ہماری تاریخ میں اخلاقی اور شرعی اعتبار سے کمزور سے کمزور بادشاہوں نے بھی چیف جسٹس کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا۔ اس بارے میں ہماری سپریم کورٹ نے ۱۹۹۶ میں نہایت اہم فیصلہ دیا ہے اور اسلامی نظائر کی روشنی میں ہمیشہ کے لیے یہ بات طے کر دی ہے کہ ججوں کے تقرر میں چیف جسٹس کے مشورے کی کیا اہمیت ہے۔ صدر مملکت کو اسے بالعموم تسلیم کرنا چاہیے، اور اگر نہ کرے تو اس کی وجہ تحریر میں لائے۔ یہ بات بھی طے ہو گئی ہے کہ چیف جسٹس کا تقرر، سپریم کورٹ کے ججوں میں سے، بالعموم سنیارٹی کے مطابق کیا جائے۔ اور سپریم کورٹ کے جج خود بھی سپریم کورٹ کے مشورے سے مقرر ہوں گے۔ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کا تقرر بھی عملاً سپریم کورٹ کے ذریعے ہی ہو گا اور صدر یا وزیراعظم کی جانب سے تقرری ایک رسمی امر ہو گا۔ یہ رسمی کام بھی وہ عوام الناس کی نیابت میں کریں گے۔ (پی ایل ڈی ۱۹۹۶، سپریم کورٹ۔ ۳۲۴، پیرا ۳۴ تا ۴۷، ص ۳۸۶ تا ۳۸۸)۔

اسلامی تاریخ میں عملاً ایسے واقعات ہوئے کہ خلیفہ نے چیف جسٹس کو کسی مقام پر قاضی مقرر کرنے کے لیے کہا ہے، یا جدید الفاظ میں کسی مقام پر جج یا قاضی کی اسامی نکالی ہے اور قاضی القضاۃ سے درخواست کی ہے کہ اس پر جج کا تقرر کیا جائے، اور بعدہ اس اسامی پر کسی معین شخص کے تقرر کی سفارش کی ہے تو قاضی القضاۃ یا علاقائی قاضی جسے ماتحت قاضی مقرر کرنے کا اختیار ہوتا تھا، انھوں نے خلیفہ کی سفارش کو رد کر

دیا ہے۔

ججوں اور ان کے مقرر کرنے والوں کا معیار

یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ ججوں کے اختیارات کیا ہیں اور ان کو متعین کرنے والی قوائے مقتدرہ کیا ہیں۔ ججوں کے اختیارات ماسوائے چند خالص انتظامی امور کے استثنا کے، زندگی کے عام چھوٹے بڑے امور تک پھیلے ہوئے ہیں اور متعین کرنے والی قوائے مقتدرہ میں بالعموم، بادشاہ، ڈکٹیٹر، عرف و دستور کے مطابق کام کرنے والے مجاز افراد، اور بعض اوقات عوام الناس شامل ہیں جو قاضی القضاۃ کو مقرر کر سکتے ہیں، یعنی جس دور اور جس سوسائٹی میں، ان میں سے جو بھی مقتدر اعلیٰ ہو۔

سوال یہ ہے کہ کیا قاضی کو مقرر کرنے والی قوتوں کے بارے میں ضروری ہے کہ وہ صالح اور اہل ہوں اور ان کی حکومت قانونی اور جائز ہو اور وہ اسلامی ضابطہ حیات کے مطابق زندگی گزارتے ہوں یا کوئی فاسق و فاجر اور غیر قانونی اتھارٹی بھی ججوں کا تعین اور تقرر کر سکتی ہے، مثلاً کوئی فاسق و فاجر کسی کو قاضی القضاۃ مقرر کر دے تو کیا وہ قاضی بن جائے گا؟ یا عرف اور دستور کے مطابق فیصلہ کرنے والی کوئی قوت فاسق و فاجر ہو، مثلاً آج کے زمانے میں صدر اور وزیراعظم جو بالعموم شریعت کے پابند نہیں ہوتے، تو کیا جج درحقیقت جج بن جائے گا؟ یا عوام میں سے فساق و فجار، کسی کو جج بنا دیں تو کیا وہ اسلامی شریعت کے مطابق قاضی القضاۃ بن جائے گا؟

فقہا کے درمیان، نہایت ہی ابتدائی زمانہ خلافت اسلامی میں، اس بارے میں اختلاف رہا ہے۔ پہلا اختلاف، فقیہ عبداللہ ابن فروخ (فارسی) اور علامہ ابن غانم قاضی افریقہ (عربی) کے درمیان ہوا۔ یہ دونوں امام مالکؒ کے شاگرد تھے۔ علامہ ابن فروخ کا کہنا یہ تھا کہ اگر کوئی فاسق و فاجر حکمران کسی کو قاضی القضاۃ مقرر کرے، تو اسے قبول نہ کرنا چاہیے جبکہ ابن غانم کا یہ کہنا تھا کہ اس کے لیے جائز ہے کہ وہ یہ منصب قبول کرے اگرچہ حاکم وقت فاسق و فاجر ہو۔ یہ بات امام مالکؒ کو لکھ کر بھیجی گئی تو ان کا جواب یہ تھا: "فارسی" کا موقف درست ہے اور جو اپنے آپ کو عربی سمجھتا ہے، وہ غلط رائے رکھتا ہے" (تبصرۃ الحکام، ابن فرحون، ج ۱، ص ۱۶)۔

البتہ امام ابوحنیفہؒ کا موقف یہ ہے کہ امام (appointing authority) کا نیک ہونا یا فاسق و فاجر ہونا، یا حاکم جابر ہونا، زیادہ اہم نہیں ہے، اصل بات یہ ہے کہ اگر امام بہت نیک بھی ہو لیکن ہو ظالم، اور اس کے تحت انصاف نہ ہو سکتا ہو، تو پھر قاضی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اس منصب کو قبول کرے (لسان الحکام، ابن شحنہ حنفی، ص ۳، حاشیہ معین الحکام)۔

درج بالا بحث سے یہ معلوم ہوا کہ اسلام قاضی القضاۃ کے منصب کو اس قدر تقدس دیتا ہے کہ اس منصب پر متعین ہونے والے افراد کا معیاری ہونا تو لازمی ہے ہی، ان کے متعین کرنے والوں اور ان کے

اختیارات (jurisdiction and authority) کے سرچشمے کو بھی، اسلام ایک جائز اور صاف سرچشمہ ہونا ضروری قرار دیتا ہے۔ اور اس کے لیے کم از کم شرائط یہ عائد کرتا ہے کہ یہ منصب اور ولایت تب قبول کی جا سکتی ہے، جب انصاف کے تقاضے پورے کیے جا سکتے ہوں۔ لیکن اگر قاضی سمجھتا ہو کہ انصاف نہ کیا جا سکے گا تو اس کے لیے یہ منصب قبول کرنا ناجائز ہے۔

قاضی کی صفات

قاضی کے لیے اسلامی نظام نے بہت کڑی شرائط رکھی ہیں۔ ان شرائط کو پورا نہ کرنے والے کسی جج کا تقرر نہیں کیا جا سکتا۔

۱۔ **مسلمان ہونا**: تمام فقہا کا اس پر اتفاق ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں قاضی کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ کوئی غیر مسلم، اسلامی ریاست میں، قضا کے عہدے پر فائز نہیں ہو سکتا۔ اس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے (**تبصرۃ الحکام**، ابن فرحون، ج ۱، ص ۱۸)۔

لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا کہ قاضی کے تقرر، اس کے اختیارات اور حدود کار کا تعین، عرف و دستور کے مطابق ہو گا۔ اگر کوئی اسلامی مملکت یہ دستوری فیصلہ کرتی ہے کہ اس میں غیر مسلم جج، اسلامی قانون اور دستور کے مطابق فیصلے کر سکتے ہیں تو اس کے لیے یہ جائز ہے۔ شریعت کا اصل مقصد یہ ہے کہ فیصلے اسلامی قانون کے مطابق ہوں۔ اگر مسلمان جج ہو اور وہ اللہ کے قانون کے مطابق فیصلے نہ کرے تو قرآن کریم اس کے لیے کافر کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ اگر ایک کافر جج، اسلامی قانون کے مطابق فیصلے کرے، تو وہ اس مسلمان جج سے اچھے موقف کا حامل ہو گا جو اسلامی قانون کو قابل عمل ہی نہیں سمجھتا۔ اسلام نے ججوں کے تقرر، ان کے اختیارات کی حدود اور ان کی شرائط کو، عرف اور دستور کے مطابق قرار دیا ہے۔ (**تبصرۃ الحکام**، ابن فرحون، ج ۱، ص ۱۳، بحوالہ علامہ ابن قیم)۔ جہاں تک پاکستان کا دستور ہے، اس میں ابھی تک کوئی ایسی پابندی نہیں ہے کہ قاضی مسلمان ہو۔

۲، ۳۔ **عاقل ہونا، بالغ ہونا**: ان دو شرائط پر بھی ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔ البتہ حالات اور دستور کے مطابق، کسی سوسائٹی کو یہ اختیار ہے کہ وہ عاقل ہونے کی شرط کی کم از کم حدود مقرر کرے، مثلاً اس قدر کافی نہیں ہے کہ کوئی پاگل نہ ہو، عاقل ہو، بلکہ اسے بہترین درجے کا عقل مند انسان ہونا چاہیے۔ ایسا عقل مند جس سے غلطی کا صدور کم از کم ہو اور نفسیاتی لحاظ سے بھی وہ درست ہو۔ نیز عدالتی حکمت عملی کو بھی سمجھتا ہو (**تبصرۃ الحکام**، ابن فرحون، ج ۱، ص ۱۸)۔

اسی طرح بلوغ کے لیے بھی، یہ کافی نہیں ہے کہ وہ بالغ ہو گیا ہو بلکہ حکومت وقت اس کے لیے عمر کی ایک حد مقرر کر سکتی ہے جو اس کے لیے معیاری سن رشد ہو۔ جیسا کہ آج کل دساتیر و روایات میں سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے ججوں کے لیے کم از کم عمر کی حد کا تعین ہوتا ہے۔ یہ امور شریعت نے ہر کسی سوسائٹی کے

اختیارات میں دے دیے ہیں کہ وہ اپنے لیے اس معاملے میں جو عرف اور دستور چاہے مقرر کر دے۔

۴- **آزاد ہونا:** اسلام نے حریت اور آزادی کو اہمیت دی ہے اور غلامی کو انسانیت سے فروتر صفت قرار دیا ہے۔ غلامی کی ایک شکل تو وہ تھی جس میں ایک شخص دوسرے کا غلام اور مملوک ہوا کرتا تھا اور بکتا بکاتا تھا۔ یہ اب نہیں ہے۔ شریعت نے یہ لازم کیا ہے کہ قاضی وہ شخص نہ ہو جو غلام ہو کیونکہ غلامی سے ضمیر بدل جاتا ہے اور لوگوں کے حقوق کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو سکتا ہے۔

دور جدید میں بھی غلامی کے طور و اطوار موجود ہیں' لہٰذا قاضی کے عہدے کا انتخاب کرتے وقت یہ دیکھنا چاہیے کہ زیر انتخاب شخص پست ذہنیت اور کمزور کردار والا نہ ہو۔ وہ عزت نفس کا مالک ہو اور ایک آزاد شہری ہو۔ آج ہمارے معاشرے میں ایسے طبقات موجود ہیں جو عام انسانی آزادیوں سے محروم ہیں' بلکہ بعض طبقات کو بااثر افراد نے غلاموں سے بھی بدتر درجے میں رکھا ہوا ہے۔ ایسے لوگوں میں ظاہر ہے کہ جوانمردی' مروت' عزم اور قوت فیصلہ کا فقدان ہوتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ آزادی کے لحاظ سے بھی ایک شخص کو دیکھا جائے۔ آج کل پیشہ وکالت میں بھی ایسے لوگ داخل ہو گئے ہیں۔ ایسے لوگوں کو چونکہ جج اور قاضی اچھی طرح جانتے ہیں' اس لیے قاضی کے تقرر میں خود قاضی القضاۃ کی رائے حتمی ہونا چاہیے۔ جیسا کہ سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے نے قرار دیا ہے۔

۵- **عادل ہونا:** جج و قاضی کے لیے عادل ہونا بہت ضروری ہے۔ عادل کے معنی ہی یہ ہیں کہ کم از کم ایسا شخص ہو جو بطور گواہ عدالت میں پیش ہو سکے۔ ظاہر روایت کے مطابق حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر بوقت تقرر عادل ہو اور بعد میں وہ غیر عادل ہو جائے تو وہ خود بخود معزول نہ ہو گا' اسے معزول کیا جائے گا۔ البتہ امام شافعیؒ اسے اہل ہی نہیں سمجھتے۔ اور یہی مسلک اصحاب ثلاثہ سے مروی ہے۔ (ہدایہ' کتاب القضا)

مالکیہ میں سے قاضی عیاض کہتے ہیں کہ اگر امام وقت کسی غیر معیاری شخص کو قاضی مقرر کر دے تو اس کے تمام فیصلے مسترد ہوں گے' اگرچہ وہ فیصلے عادلانہ ہوں اور انصاف و قانون کے تقاضوں کے مطابق کیے گئے ہوں۔ لیکن امام مالکؒ کے دوسرے اہم راوی سحنون کہتے ہیں کہ اس کے فیصلے درست ہوں گے۔ جب تک اسے معزول نہیں کر دیا جاتا' وہ قاضی رہے گا اور فیصلے نافذ ہوں گے مگر اس کا معزول کیا جانا لازمی ہے (تبصرۃ الحکام' ابن فرحون' ج ۱' ص ۱۸)۔ امام شافعیؒ بھی اس طرف گئے ہیں کہ کوئی فاسق قاضی نہیں بن سکتا اور اگر کسی نے کسی فاسق اور غیر معیاری شخص کو قاضی مقرر کر دیا تو اس کے تمام فیصلے کالعدم ہوں گے۔ امام ابوحنیفہؒ اس طرف گئے ہیں کہ ایک فاسق بھی قاضی بن سکتا ہے اگرچہ' کسی فاسق اور غیر معیاری شخص کو قاضی مقرر کرنا کوئی اچھا فعل نہیں ہے۔ اس طرح احناف کے نزدیک ایسے شخص کے فیصلے نافذ ہوں گے جب تک کہ اسے معزول نہیں کیا جاتا (بدائع الصنائع' الکاسانی' ج ۷' ص ۳)۔

یہ ایک فنی قسم کا اختلاف ہے۔ تمام فقہا' فاسق کو جج و قاضی بنانا پسند نہیں کرتے۔ اگر بن جائے تو

دوسرے ائمہ اس کے فیصلوں کو بھی رد کرتے ہیں لیکن امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ فیصلوں کو رد نہ کیا جائے۔ امام ابو حنیفہؒ کا مسلک زیادہ عملی ہے۔ سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے کے نتیجے میں یہی سوال پیدا ہو گیا ہے کہ موجودہ حکومت نے ایک پارٹی کے کارکنوں کو جج بنا دیا، سپریم کورٹ نے ان کی تقرری کو کالعدم کر دیا۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے فیصلے کیے ہوں گے۔ مناسب یہی ہے کہ فیصلوں کو نافذ سمجھا جائے ورنہ لوگوں کے لیے بڑی مشکلات پیدا ہوں گی اور مقدمہ بازی کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

۶- **جج کا مرد ہونا:** امام شافعیؒ، امام احمد ابن حنبلؒ اور امام مالکؒ کہتے ہیں کہ عورت منصب قضا کے لیے اہل نہیں ہے۔ ان کے نزدیک عورت کی شخصیت میں کچھ کمزوریاں ہیں جن کی وجہ سے اس کو قاضی کی ذمہ داریاں دینا مناسب نہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ عورت حدود کے علاوہ تمام دوسرے معاملات میں قاضی بن سکتی ہے، اس لیے کہ حدود کے علاوہ تمام دوسرے معاملات میں اس کی گواہی معتبر ہے، نیز عورت اگر مفتی ہو سکتی ہے تو جج بھی ہو سکتی ہے (بدائع الصنائع، الکاسانی، ج ۷، ص ۳)۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک قضا کی اہلیت، شہادت میں اہلیت کے ساتھ چلتی ہے۔ اگر کسی معاملے میں عورت کی شہادت جائز نہ ہو، تو اس معاملے میں عورت قاضی بھی نہیں ہو سکتی۔ حدود میں عورت کی شہادت کے بارے میں فقہا کے درمیان اختلافات ہیں۔ عام رائے کے مطابق، جس کی اساس پر پاکستان کے قوانین حدود مدون ہوئے ہیں، حدود میں عورت کی شہادت قبول نہیں ہے۔ فقہا نے یہ رائے سورہ نور آیت (۴) کے الفاظ "اربعہ شھداء" کی بنا پر اختیار کی ہے کہ اربعہ عدد مونث ہے تو معدود بدل مذکر ہو گا۔ لیکن یہ استدلال آیت (۶) کی تشریح میں قائم نہیں رہتا جس میں صرف شہدا کا لفظ ہے جو مرد و عورت دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور آیت (۴) قذف اور آیت (۶) لعان میں الزام کی نوعیت ایک ہے یعنی الزام بدکاری۔ (اس سلسلے میں تفصیلات کے لیے دیکھیے فیڈرل شریعت کورٹ کا فیصلہ بیگم رشیدہ پٹیل بنام سرکار۔ (پی ایل ڈی ۱۹۸۹، فیڈرل شریعت کورٹ، ص ۹۵)

عورت کے لیے بعض اہم کاموں کا عدم جواز، اس وجہ سے نہیں ہے کہ اسلام مرد کے مقابلے میں عورت کو فروتر مخلوق سمجھتا ہے، بلکہ اس میں دراصل عورت کی فطرت، نفسیات اور اس کی شخصیت کے بعض پہلوؤں کی وجہ سے عورت کو بعض مشکل امور سے مستثنیٰ کیا گیا ہے، مثلاً سربراہ مملکت ہونا، جج ہونا، افواج کا کمانڈر انچیف [illegible] اور عدالتوں میں گواہی دینا۔ یہ تمام امور مشکل امور ہیں اور اسلام صنف نازک ہونے کے حوالے سے، ان کو عورت کے سپرد کرنے کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔

امام ابو حنیفہؒ کا مسلک اس سلسلے میں زیادہ عملی ہے۔ بعض اوقات کوئی سوسائٹی مجبور ہو سکتی ہے کہ اس میں کسی عورت کو جج مقرر کیا جائے۔ لہٰذا اس کا دروازہ بالکل بند بھی نہ ہونا چاہیے۔

۷- **جج کا مجتہد ہونا:** جج کی علمی قابلیت کے نکتے پر علما کے درمیان اختلاف رائے ہے۔ امام

ابو حنیفہؒ کی رائے یہ ہے کہ ترجیح تو ایسے شخص کو دی جائے گی جو مجتہد ہو اور قرآن و سنت اور اقوال صحابہ اور فقہا کی آرا کو سامنے رکھ کر مجتہدانہ فیصلہ کر سکتا ہو، لیکن اگر ایسا شخص دستیاب نہ ہو تو ایک عام تعلیم یافتہ شخص بھی جج بن سکتا ہے جو دوسروں سے پوچھ کر فیصلے کر سکتا ہو۔ اس کے فیصلے نافذ ہوں گے بشرطیکہ وہ شریعت کے مطابق ہوں۔

امام شافعیؒ اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جاہل بلکہ غیر مجتہد کو سرے سے قاضی مقرر ہی نہیں کیا جا سکتا اور اگر کوئی حاکم ایسا تقرر کرے تو باطل (void) ہو گا۔ امام شافعیؒ قاضی کے علمی مقام کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ کتاب اللہ، سنت رسولؐ اللہ، قرآن و سنت کے حوالے سے سلف صالحین کی تعبیرات اور نصوص شریعت سے استنباط اور قیاس احکام کی صلاحیت رکھتا ہو۔ (احکام سلطانیہ، الماوردی، ص ۶۶-۶۷)

امام احمد ابن حنبلؒ "کتاب اللہ، سنت رسولؐ" اجماع و قیاس اور فقہا کے اختلافات کے علاوہ اس کے لیے عربی زبان کا علم بھی بقدر ضرورت، ضروری سمجھتے ہیں۔ (المغنی، ابن قدامہ، جلد ۹، ص ۴۱-۴۴) مگر احناف نے جو رائے اختیار کی ہے، وہ بعض ضروری حالات کے پیش نظر کی ہے، کیونکہ ایسے حالات ہو سکتے ہیں کہ اہل علم موجود نہ ہوں یا وہ کسی وجہ سے یعنی امام کے غیر عادل ہونے کی وجہ سے، عہدہ قبول کرنے کے لیے ہی تیار نہ ہوں تو جاہل یا کم عالم کو مقرر کر کے یہ ہدایت دی جا سکتی ہے کہ وہ علما، وکلا اور مفتیان کرام سے پوچھ کر یہ کام کرے۔ احناف نے اس جواز کی یہی علت بتائی ہے (بدائع الصنائع، الکاسانی، ج ۷، ص ۳)۔ ورنہ وہ بھی اس قسم کی تعیناتی کو فاسد اور غیر مناسب بہرحال کہتے ہیں۔

لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ججوں کا درجہ اجتہاد تک شریعت کا عالم ہونا بالاتفاق مستحسن ہے۔ دوسرے ائمہ، جاہل کے تعین کو باطل (void) قرار دیتے ہیں اور احناف اسے فاسد (voidable) قرار دیتے ہیں۔ احناف کے نزدیک اگر اس قسم کا کوئی جج فیصلہ کر دے تو وہ مردود نہ ہو گا، بشرطیکہ فیصلہ قانون شریعت کے مطابق درست ہو۔ دیگر ائمہ کے نزدیک وہ مردود اور باطل ہو گا اگرچہ وہ میرٹ پر ہو اور قانون کے مطابق ہو۔

دور حاضر کے دساتیر و ضوابط میں ججوں کے لیے جدید زمانے کے تقاضوں کے مطابق علمی شرائط مقرر کر دی گئی ہیں۔ درج بالا تصریحات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کے لیے تو نہایت ہی سخت اور کڑی شرائط درکار ہیں اور ماتحت عدالتوں کی تقرری کے لیے قدرے نرم شرائط مناسب ہیں۔

۸- **سماعت و بصارت اور نطق کی صلاحیت:** سننے اور دیکھنے کی قوت کی صحت و سلامتی پر قاضی عیاض نے اجماع نقل کیا ہے۔ یہی مشہور و معروف رائے ہے۔ امام مالکؒ سے یہ روایت ہے کہ اندھے کا فیصلہ نافذ ہو گا۔ وثائق ابن قاسم میں اس کی تصریح موجود ہے اور یہ کہا گیا ہے۔ علامہ ابن شاسؒ نے کہا ہے کہ قاضی کی تقرری کے لیے یہ لازمی شرط ہے۔ اگر قاضی ان صفات میں سے کسی ایک صفت سے محروم ہو

جائے تو اس کی تعیناتی کو منسوخ کیا جائے گا (تبصرۃ الحکام، ابن فرحون، ج ۱، ص ۱۸-۱۹)

قاضی اور فقہی مسالک و مذاہب

فقہا نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ قاضی مشہور مذاہب و مسالک میں سے کسی ایک مذہب اور مسلک کے مطابق فیصلے دینے کا پابند نہ ہو گا اور نہ ہی اس کی تعیناتی کرنے والی اتھارٹی، اسے پابند کر سکتی ہے کہ وہ فلاں مذہب اور مسلک کے مطابق فیصلے کرے گا۔ اگر کسی ریاست کا سربراہ حنفی ہو تو وہ قاضی القضاۃ کو پابند نہیں کر سکتا کہ وہ حنفی مسلک یا مالکی مسلک یا کسی دوسرے مسلک کے مطابق فیصلے کرے گا۔ قاضی فقط کتاب اللہ اور سنت رسولؐ اللہ کے مطابق فیصلے کرنے کا پابند ہے اور اس کے بعد وہ اس بات کا پابند ہے کہ وہ اپنی رائے اور قیاس کے مطابق فیصلے کرے یا اشباہ و نظائر کے مطابق فیصلے کرے۔ البتہ شافعی اور مالکی اس قسم کے تقرر کے حکم کو کالعدم (void) تصور کرتے ہیں۔ احناف کہتے ہیں کہ تقرر درست ہے اور شرط باطل (void) ہے (تبصرۃ الحکام، ابن فرحون، ج ۱، ص ۱۶)۔

اس سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے یہ رائے اختیار کی ہے کہ قاضی کے لیے اس قدر علمی قابلیت ضروری ہے کہ وہ اجتہاد کر سکے، ان کی یہ رائے حضور اکرمؐ کی ہدایات، خلفاے راشدین کی ہدایات اور تمام ائمہ مجتہدین کی ہدایات کے زیادہ قریب ہے۔

نیز پاکستان کے جید ۳۱ علما کے ۲۲ نکات میں بھی یہی طے کیا گیا ہے کہ فیصلے قرآن اور سنت کے مطابق کیے جائیں گے (نکتہ دوئم)۔

علما کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اختلافی مسائل اور اختلافی آرا میں سے اگر کوئی جج کسی ایک رائے کو ترجیح دے دے تو اس کا اثر یہ ہو گا کہ اس مخصوص مقدمے میں گویا یہ مسئلہ اب اختلافی نہیں رہا۔ اور وہی رائے نافذ ہو گی جسے کسی جج نے اپنے عدالتی فیصلے میں ترجیح دے دی ہے، مثلاً حال ہی میں لاہور ہائی کورٹ نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہو سکتا۔

علما نے یہ رائے اس لیے اختیار کی ہے کہ اگر اس اصول کو تسلیم نہ کیا جائے تو ججوں کے فیصلے متضاد ہوں گے اور کبھی کوئی فیصلہ نافذ نہ ہو سکے گا اور کبھی تنازعے کا آخری فیصلہ نہ ہو سکے گا۔ (الفروق، شہاب الدین قرافی، جلد ۲، ص ۱۰۵)

اس اصول سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جج کا مجتہد ہونا ضروری ہے۔ جس طرح ہمارے دستور کے آرٹیکل ۱۸۹ میں طے کر دیا گیا ہے کہ اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کو مجتہد ہونا چاہیے۔

اسلامی قانون نے اس قسم کی شرائط کو اس لیے باطل قرار دیا ہے کہ جج اسلامی تصور عدالت کے مطابق قرآن و سنت اور خدا اور رسول کا نائب اور وفادار ہوتا ہے، اور اسے ایسا ہونا چاہیے اور وہ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر وہ امام (appointing authority) کا نوکر اور خادم ہے۔ (تبصرۃ الحکام، ابن فرحون، ج ۱، ص ۱۷)

یہ ہیں وہ چند اہم خدوخال جو اسلامی عدلیہ میں ہمیشہ نمایاں رہے ہیں۔ (تدوین و تلخیص: **مسلم سجاد**)